منشی پریم چند کے افسانوں میں سماجی شعور

ڈاکٹر محمد اعجاز تبسم

Dr. Muhammad Ijaz Tabassam

Assistant Professor, Department of Urdu,
Lahore Garrison University, Lahore.

بشریٰ اسحاق

Bushra Ishaq

M.Phil Scholar, Department of Urdu,
Lahore Garrison University, Lahore.

Abstract:

Prem Chand has a great importance in the history of Urdu fiction. He has depicted the village life and natural living style of people very artistically through his short stories. His social conscious distinguish of the culture and traditional society of his age. At the same time he has highlighted the current issues of human society in the perspective of modern age of his time. He portraits the pictures of the society, with great skill and powerful expressions. He also described the village culture, the economic, religious and political issues through his short stories especially in Pachtawa (1914) Panchayat (1916) Sawa Ser Geehon (1924), Pawas ki Raat (1930) and Kafan (1935) got a significant popularity on the horizon of Urdu literature. This tradition can be scene in the literary works of Balwant Singh, Rajhinder Singh Baidi and Ahmad Nadim Qasmi. In this essay all the facts are described in details through the references of Prem Chand's short stories.

کسی بھی ملک میں چھوٹے بڑے شہروں کی تعداد کافی ہوتی ہے لیکن اس کا بیشتر حصہ دیہات پر مشتمل ہوتا ہے اور زیادہ آبادی دیہات میں رہتی ہے۔ جسم میں جو اہمیت دل کی ہوتی ہے ملک میں وہی اہمیت دیہات کو حاصل ہے کیونکہ دیہات کے ماحول اور معاشرے کی تصویر ہی بنیادی طور پر ملک کی اصل تصویر ہوتی ہے۔ اس تصویر کے ہر رنگ کو پوری طرح دیکھے بغیر ہم ملک

کو صحیح معنوں میں نہیں دیکھ سکتے۔ ملک کے مختلف خطوں، دیہات کے حسین مناظر موسم، فصلیں، رہن سہن، تہذیب وتمدن، میلے ٹھیلے، رسوم ورواج، جذباتی الجھنیں، نفسیاتی مسائل، معاشی مسائل وغیرہ جب تک انسان کے سامنے نہ ہوں اس وقت تک اس ملک کا حقیقی روپ سامنے نہیں آسکتا۔ ایک پرانی کہاوت ہے کہ ''شہر انسان نے بسائے اور گاؤں خدا نے'' اور فطرت سے قربت کی وجہ سے گاؤں ہمیشہ سادگی کا مرکز رہے ہیں۔(۱)

دیہات کا رہن سہن، زندگی بسر کرنے کے طریقے شہر سے بہت مختلف ہیں۔ شہری زندگی مشینی زندگی ہے۔ انسان کے پاس ایک دوسرے کے لیے وقت نہیں ہے لیکن دیہات کے لوگ ایک دوسرے کے دُکھ درد میں شریک ہونا اپنا فرضِ اوّلین سمجھتے ہیں۔ شہری زندگی سکون سے عاری ہے جبکہ دیہات کی زندگی میں اطمینانِ قلب کی فراوانی ہے۔ سہولیات شہر کی نسبت کم ہیں لیکن پھر بھی دیہات میں لوگ خوش اور مطمئن زندگی گزارتے ہیں۔ دیہات کی تہذیب شہر کے تمدن سے خاصی مختلف ہے۔ اس کا تعلق چونکہ زراعت سے ہے لہٰذا دیہات کے لوگ زمین سے چمٹے ہوئے ہیں لیکن ان کی نظر آسمان کی طرف رہتی ہے۔ بارش سے زمین سیراب ہوتی ہے جس سے فصل زیادہ ہونے کی اُمید تازہ ہوجاتی ہے۔ اگر بارش نہ ہوتو کسان بھوک، افلاس کا شکار ہوجاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے کسان کی اُمید بڑھ جاتی ہے۔ ان لوگوں کا ذریعہ معاش ہی زراعت سے منسلک ہے۔ اور یہی ان کی روزی روٹی ہے۔ دیہات کے لوگ سادہ دل ہوتے ہیں اور خوشی ان کے لیے بہت اہمیت رکھتی ہے۔ قدیم دیہات کے معاشرے میں جاگیرداری نظام تھا اور جاگیرداروں نے غریب لوگوں کو اپنی انگلیوں پر نچا رکھا تھا۔ لیکن یہ کھیل ابھی بھی ہمارے سماج کا حصہ ہے۔ لہٰذا اس استحصالی نظام میں ایسے کردار جنم لیتے ہیں جو سماجی اور نفسیاتی مطالعے کا یکسر الگ مواد مہیا کرتے ہیں۔

ادب، سماج اور ماحول کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ وہ اپنے موجودہ حالات کا بہترین عکاس بھی ہے لہٰذا سماج کے ہر رُخ کو ادب کا خزینہ بنایا جاسکتا ہے۔ برّصغیر میں اُردو ادب نے جب سے ظہور پایا۔ اس میں شاعری اور نثر دونوں میں برّصغیر کی متحرک زندگی اور سماج کی رنگارنگ عکاسی موجود ہے۔ بالخصوص تمام اصنافِ سخن میں برّصغیر کی تہذیبی زندگی موجود ہے۔

اُردو افسانہ بیسویں صدی کے شروع میں ظہور پذیر ہوا۔ جس میں برّصغیر کا عکس موجود ہے۔ اُردو افسانوں میں دیہات کے لوگوں کے جذبات ومسائل کو بڑی دیدہ ریزی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد برّصغیر کی سیاسی کایا پلٹ گئی۔ انگریزوں نے برّصغیر پر حکومت شروع کر دی اور اس طرح لوگوں کی سوچ بھی بدلنا شروع ہوگئی۔ معاشرے کی اس تبدیلی نے انسان کو بھی اپنی ذات کی طرف مائل کیا۔ انسان کی طرح اس وقت ادب میں بھی تبدیلی آئی۔ انگریزی علوم اور زبان کے ساتھ بہت سی دوسری اصنافِ ادب نے برّصغیر میں قدم رکھا۔ فورٹ ولیم کالج نے تراجم کروائے۔ انگریزی ادب کو اُردو میں ڈھالنے کی بھرپور کوشش کی گئی۔ ادب میں ایک نئی روایت نے جنم لیا۔ پُرانی روایات سے انحراف ہونے لگا۔ داستان مافوق الفطرت عناصر سے نجات حاصل ہوگئی اور لوگ حقیقت نگاری کے میدان میں قدم رکھنے لگے۔ ان لوگوں میں رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر، مرزا ہادی رسوا اور ڈپٹی نذیر احمد نے اس تبدیلی کا بیڑہ اُٹھایا۔ سرشار کے نثری ذخیرے سے ہمیں لکھنؤ کی مخصوص تہذیبی زندگی کا پتہ چلتا ہے کہ لوگوں کا رہن سہن کیا تھا۔ عبدالحلیم شرر نے ناول کے ذریعے اسلامی طرزِ حیات سے آگہی کا سفر شروع کیا اور ڈپٹی نذیر احمد نے گھریلو زندگی کے بارے میں ہمیں آگاہ کیا کہ اس وقت کے لوگوں کے گھر کی معاشرت کیا ہے۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں انگریز حکومت نے اپنے قدم برّصغیر میں مضبوطی سے جما لیے۔ وہ بخوبی جانتے تھے

کہ اگر قدم اور مضبوط کرنے ہیں تو شہروں کو اہمیت دینا ہوگی۔ وہ دیہات سے خام مال اور اجناس لا کر شہروں میں کاروبار کرتے تھے تاکہ صنعتی ترقی ہو سکے۔ برّصغیر میں اسی فیصد لوگ دیہات میں رہتے تھے۔ لہٰذا انگریز حکومت نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت شہروں کو ترقی دی اور دیہات کو نظرانداز کیا۔ دیہات کے لوگ اپنی ضروریاتِ زندگی کے لیے ترس رہے تھے۔ لہٰذا لوگوں نے دیہات سے شہر کی طرف نقل و حرکت شروع کر دی۔ جب انھوں نے شہر کی رونق دیکھی تو ان کو اپنی محرومی کا احساس ہونے لگا۔ اس احساسِ محرومی نے اُردو افسانے کو متاثر کیا اور بہت سی کہانیوں نے جنم لیا۔ دیہات اس دور میں خیر و فطرت کی علامت اور شہر شر کی علامت دکھائی دیتے ہیں۔ دیہات کے لوگ سادہ لوح، صداقت، انسان دوستی کے جذبات لیے ہوئے ہیں۔

دیہات کے لوگ خون اور پسینہ بہانے والے محنتی لوگ ہیں۔ وہ اپنی محنت سے روزی روٹی کماتے ہیں۔ جاگیرداروں نے اس محنت کش طبقے کا استحصال کیا اور ناانصافی کی۔ دوسری طرف دیہاتی ماحول اور مناظر کا جائزہ لیا جائے تو یہاں فطرت نے اپنے رنگ بوقلموں انداز میں بکھیرے ہیں۔ یہاں کی ہر چیز میں حُسن جھلکتا ہے۔ کھیتیاں پروان چڑھتی ہیں۔ میلے ٹھیلے ہوتے ہیں۔ قدرت کے حسین مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں جس میں بہتی ندیاں، چشمے، کھلی فضا اور گھنے درخت فطری زندگی کا عکس بکھیر رہے ہیں۔

پریم چند اُردو افسانہ کی تاریخ میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ ان کا نام علیحدہ کرنے سے اُردو افسانہ نگاری کی روایت سے واقفیت حاصل کرنا ممکن نہیں۔ اس سے پہلے اُردو افسانوی ادب میں مافوق الفطرت عناصر اور داستانوی رنگ موجود تھا۔ لیکن پریم چند نے حقیقت نگاری کی طرف توجہ مبذول کرائی۔ اس کی بنیادی وجہ اس وقت کے حالات تھے جب برطانوی سامراج نے ہندوستان کو اپنے شکنجوں میں جکڑا ہوا تھا۔ انگریز اپنے مفادات کے لیے برّصغیر کے عوام کو استعمال کر رہے تھے۔ پورے معاشرے میں انتشار پھیلا ہوا تھا۔ ہر طرف بے بسی عالم تھا۔ انھوں نے ایک خاص حکمت عملی سے جاگیردارانہ نظام پر سرمایہ داری کو ترجیح دی۔ یوں برّصغیر کا اقتصادی، سماجی، تہذیبی اور اخلاقی ڈھانچے شکست و ریخت کا شکار ہو گیا۔ پروفیسر صغیر ابراہیم اس عہد کے بے بس معاشرے کی تصویر یوں کھینچتے ہیں:

> ''برطانوی حکمت عملی تھی کہ ملک میں جاگیرداری نظام پر سرمایہ دارانہ نظام کا رڈا اس پر رکھا گیا کہ اس کا اقتصادی، سماجی، ثقافتی اور اخلاقی ڈھانچہ تباہ ہو کر رہ گیا۔ نتیجہ میں پورا معاشرہ عام بے بسی کا شکار ہوا۔'' (۲)

منشی پریم چند اپنے افسانوں میں سماجی حقیقت نگاری کے ذریعے عوام کے کئی مسائل کو سامنے لائے۔ انھوں نے اس وقت لوگوں کے سماجی مسائل کا بغور مشاہدہ کیا جس پر وہ احتجاج کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ پریم چند کے افسانوں کی خاصیت ایک طرف تہذیبی شعور کے در کھولتی ہے تو دوسری طرف وہ اپنے سماجی شعور کے پیشِ نظر معنویت سے بھرپور حقیقی زندگی کی داستان پیش کرتے ہیں جس میں وہ اپنی مٹی کی بو باس سے جڑے ہوئے ہیں۔ ان کے تخیل کی رفعتیں اپنے سماج و تہذیب میں اپنی جڑیں پیوست کیے ہوئے ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں اپنے عہد کے دیہاتی سماج کے مختلف پہلوؤں کو نہایت خوبصورتی سے زینتِ قلم کیا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کا کہنا ہے:

> ''پریم چند زمین کی سوندھی سوندھی باس سے بہت قریب تھا۔ اس نے تخیل کی رفعتوں کے بجائے زندگی کے ارضی پہلوؤں اور سماج کی واضح کروٹوں کو اپنے افسانوں کا موضوع

بنایا۔''(۳)

منشی پریم چند کا عہد آج سے ذرا مختلف تھا۔ انھوں نے اپنے عہد کے معاملاتِ زندگی، عیوبِ زمانہ اور دیگر سماجی محاسن ومعائب کو عصری تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کی سرتوڑ کوشش کی۔ اگرچہ پریم چند کے عہد اور آج کے عصری رجحانات مختلف ہیں مگر دورِ حاضر میں بھی ان کے افسانوں کی افادیت برقرار ہے۔ وہ ایک حساس قلم کار کی حیثیت سے انسانیت کے دُکھ درد کو سمجھنے والے تھے۔ انھوں نے اپنی قلمی صلاحیت سے برّصغیر کے جمود پذیر سماج کو متحرک کرنے کی سعی کی۔ وہ درحقیقت اپنے عہد کے پسے ہوئے سماج اور متوسط طبقے کی اذیت ناک زندگی کے نوحہ گر ہیں۔ ان کے افسانوں میں اصلاح کا عنصر نمایاں ہے۔ انھوں نے اپنی تحریر کو تفریحِ طبع کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ زندگی کے مسائل کو حل کرنے اور سماجی، سیاسی وتہذیبی شعور کو بیدار کرنے کا وسیلہ بنایا۔

پریم چند نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ دیہات میں گزارا۔ وہ ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم وتربیت بھی ان ہی کھیت، کھلیانوں، باغ، باغیچوں، کچے مکانوں اور سادہ لوح محنتی کسانوں کے درمیان ہوئی تھی۔ جس نے انھیں فطرت پسند اور عوام دوست بنا دیا۔ لہٰذا اسی انسان دوستی کے پیشِ نظر انھوں نے اپنی تخلیقات میں برّصغیر کے محنت کش طبقے کی سماجی زندگی کی حقیقی تصویرکشی کی۔ ان کی بھوک پیاس، بیماری وافلاس میں ڈوبی حیات اور کئی اخلاقی عوارض میں مبتلا ذہنیت کو اک منفرد درسِ حیات دیا۔ نئے زرعی نظام کے ناقابلِ برداشت قواعد وضوابط تلے سسکتی ہوئی انسانیت کو ایک باشعور زندگی اور جہدِ مسلسل کی طرف گامزن کیا۔ ''اُردو افسانہ: فکری وفنی مباحث'' میں عظیم الشان صدیقی اسے ان کی اخلاقی ذمہ داری اور فرضِ اوّلین قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ایک ادیب وفنکار کی حیثیت سے ان کا یہ فرض بھی تھا کہ وہ گرے پڑے عوام، غریب و محنت کش انسانوں کے دُکھ درد میں شریک ہوکر ان کی زندگیوں کو بہتر بنانے کی جدوجہد میں حصہ لیں جو بھوک و پیاس، بیماری و افلاس اور نئے زرعی نظام کے بوجھ تلے دبے ہوئے سسک رہے تھے۔''(۴)

منشی پریم چند یقیناً اس سسکتے اور دم توڑتے سماج کے نغمہ گر ہیں انھوں نے عوام کے دُکھ درد کو محسوس کیا اور ان کو بہتر بنانے کے لیے اپنے قلم کو متحرک رکھا جس میں وہ کسی حد تک کامیاب بھی رہے۔ آپ نے اپنے افسانوں میں دیہاتی سماج، انسان کا اپنی دھرتی سے راہ ورسم وفاداری، ایک دوسرے سے مربوط رشتۂ معاشرت، تہذیبی وسماجی اقدار وروایات اور طرزِ زیست کے مختلف مناظر کو پیش کیا ہے۔ ان کے افسانوی کردار نچلے طبقے سے ہیں جو معصوم سادہ لوح اور مظلوم ہیں۔ وہ اپنے عہد کے ہاتھوں بے بس اور لاچار ہیں۔ پریم چند کی ہمدردی شروع سے زمین دار ساہوکار اور پنڈت کے مقابلے میں کسانوں، مزدوروں اور دیہات کے سادہ لوح لوگوں کے ساتھ رہی ہے۔ آپ نے افسانوں میں اپنے عہد کی جیتی جاگتی زندگی کی تصویر پیش کی ہیں۔ بالخصوص انھوں نے دیہاتی زندگی سے اپنی فطری وذہنی ہم آہنگی کے پیشِ نظر شکست وریخت کا شکار تہذیبی وسماجی اقدار وروایات اور جدید عہد کے تقاضوں کے مطابق ڈھلتے ہوئے معاملاتِ زندگی کو نہایت عمدگی کے ساتھ اپنی تحریر میں مصوّر کیا ہے۔ دیہات کی حقیقی زندگی کی داستان کو رقم کرنے کا فن پریم چند کو خوب آتا ہے۔ وہ اپنے وقت کے باکمال نبّاض تھے انھوں نے فکرِ فردا میں امروز سے ذوقِ جستجو پایا اور ماضی کی کھوج سے سبق آموز زندگی کے خزینے تلاش کیے۔ فرزانہ شاہین لکھتی ہیں:

> ''دیہی زندگی کی ترجمانی میں پریم چند کا کوئی ثانی نہیں۔ وہ ایسی جاندار، عمدہ، سچی اور متحرک

تصور اُبھارتے ہیں کہ پڑھنے والا ان کا قائل و مداح ہو جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ پریم چند نے جہاں زندگی گزاری وہ بیشتر دیہی علاقے تھے۔ ان کا گاؤں لمہی ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ گورکھپور بھی اس وقت کوئی شہر نہ تھا۔ جو کچھ انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، اسے اپنے افسانوں میں پیش کر دیا۔ ان کا کمال ضرور ہے کہ انھوں نے الفاظ کی مدد سے ہو بہو تصویر مرتب کر دی۔ وہ وقت کی نبض کو اچھی طرح محسوس کر سکتے تھے۔''(۵)

لہٰذا انھوں نے دیہات و پنجاب کلچر کے سماجی، معاشی، مذہبی، سیاسی اور تہذیبی طرزِ زیست کے مختلف حقائق کو بڑی وارفتگی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ایسے افسانوں کی تعداد تقریباً ۵۶ ہے۔(۶) جن میں بالخصوص ''پچھتاوا''، ''بیٹی کا دھن''، ''پنچائیت''، ''سوا سیر گیہوں''، ''پوس کی رات'' اور ''کفن'' نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ جہاں چلتے پھرتے کردار پنجاب کی دھرتی کا تہذیبی عکس، چوپال، کھیت کھلیان، میلے ٹھیلے، گاؤں کا سماجی رنگ، متوسط طبقے کے باہمی میل جول، معمولاتِ زندگی اور رسم و رواج کا تذکرہ اپنا جمال دکھا رہا ہے وہاں ان کا تنقیدی شعور سماجی طنز کی صورت میں رونما ہوا ہے۔ پریم چند پہلے افسانہ نگار ہیں جنھوں نے افسانے کو ادبی گھٹن سے نکال کر گاؤں کی کھلی فضا میں پیش کیا۔ اسی حوالے سے نریندر کمار لکھتے ہیں: ''پریم چند نے پہلی بار افسانہ میں گاؤں کی کھلی ہوئی زندگی، اس کے میلے ٹھیلے، کھیت کھلیان، چوپال اور گاؤں کے سماجی رشتوں کو پیش کیا۔''(۶)

ان سماجی و تہذیبی قرابت داری کے سلسلوں کو محض جذباتی اور مذہبی جبر کا نتیجہ قرار دینا مناسب نہیں۔ یہ المیاتی تاثر کہیں کہیں اپنا جادو جگاتا ہے۔ مگر ان میں زیادہ تر دیہاتی لوگوں کے مابین خلوص و سچے جذبات اور التفات کا عنصر اہم ہے۔ پریم چند اُردو افسانے کی تاریخ میں اس حوالے سے بھی اہم ہیں کہ انھوں نے دیہاتی رنگ کو مستحکم کرنے کی لگن کی۔ بعد ازاں بلونت سنگھ، راجندر سنگھ بیدی اور احمد ندیم قاسمی نے اسی روایت کے تسلسل میں دیہات میں ہونے والے تہوار و رسوم و رواج اور عام انسانی زندگی کو منظرِ عام پر لانے کی کوشش کی۔ پریم چند نے اپنے عہد کی سماجی زندگی کا حُسن، اس کی رعنائی و توانائی، بلندی و پستی، اچھائی و بُرائی حتیٰ کہ اس کے جلال و جمال اور زوال کا جو ہر جو کچھ تھا اور جیسا تھا ویسا ہی پیش کیا۔ خاص کر غریبوں، محروموں اور ذلتوں کے مارے لوگوں کے مصائب، ان کی زندگی کی مجبوری و لاچاری کو اور امیر طبقے کے سامنے دم توڑتی سسکتی خواہشات کو موضوع بنایا۔

''بے غرض محسن'' افسانہ دیہی ماحول کا نمائندہ افسانہ ہے۔ دیہی زندگی کی مختلف حقیقتیں اس افسانہ میں جلوہ گر ہیں۔ پریم چند دیہات میں ہونے والے تہواروں، میلوں، ٹھیلوں کو بڑی جزئیات سے پیش کرتے ہیں۔ کیونکہ انھوں نے دیہات کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور ان تہواروں، میلوں ٹھیلوں کا گہرا مشاہدہ کیا ہے۔ اسی مشاہدے کو انھوں نے اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے: ''ساون کا مہینہ تھا، ریوتی رانی نے پاؤں میں مہندی رچائی، مانگ چوٹی سنواری۔ اور تب اپنی بوڑھی ساس سے جا کر بولی۔ ''اماں جی آج میں میلہ دیکھنے جاؤں گی۔''(۷)

افسانہ ''بے غرض محسن'' ۱۹۱۰ء میں لکھا گیا تب برطانوی سامراج قائم تھا۔ اس لیے اس کے مرکزی کردار میں غرور، گھمنڈ اور خود پرستی کے عنصر نمایاں ہیں۔ جسے نئے نئے اقتدار کا نشہ چڑھا ہوا ہے۔ اس افسانے میں کئی جگہوں پر جبر و استبداد کی چکی میں پستا ہوا سماج انصاف کے دھندلے ہوئے آئینے میں اپنا عکس دیکھ رہا ہے۔ پریم چند نے شعوری و لاشعوری طور پر ایسے

طبقے کو نشانِ طنز و تضحیک بنایا ہے جس نے دولت کے نشے میں چُور رہ کر سفید پوش طبقے پر اپنا شکنجہ مضبوط کیا اور ان کی سسکتی ہوئی زندگی کو موضوعِ بحث بنایا۔ ''اُردو افسانہ: فکری و فنی مباحث'' میں درج ہے:

''ہیرا من اس نوزائیدہ زمین دار طبقہ کا فرد ہے جس نے برطانوی استبدادی نظام کے بطن سے جنم لیا ہے۔ اس لیے اس کی فطرت میں خشونت، خود غرضی، نودولتیا پن اور جھوٹے اقتدار کی ہوس کے وہ تمام پہلو موجود ہیں۔ جسے نئے اعلیٰ متوسط طبقہ شناخت کہا جا سکتا ہے۔''(۸)

''بے غرض محسن'' کے اختتام پر ہیرا من تخت سنگھ کو امر کر دیتا ہے اور اس کا نام ہمیشہ لوگ یاد رکھتے ہیں جب وہ اپنے گم نام محسن کے نام سے دھرم شالہ اور شوالہ بنا دیتا ہے۔ تخت سنگھ مر کر بھی زندہ رہتا ہے اس کی نیکی کام آ جاتی ہے جو اس نے ہیرا من کی جان بچا کر کی تھی۔ الغرض زمیندار کی انسانیت سوز ہٹ دھرمی سے اس میں المیاتی تاثر برقرار رہتا ہے مگر پریم چند نے ''اسامی'' جیسے کردار کے ذریعے خودداری کو غیرت مندی اور بے غرض زندگی کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا ہے اور اس میں ایک توازن قائم کیا ہے۔ گاؤں کی حقیقی زندگی کی یہ داستان ایک مثالی صورت حال کو سامنے لاتی ہے جس سے اس کا اختتام بھی قاری پر ایک اچھا مثبت تاثر چھوڑ جاتا ہے۔ افسانے کے اختتام کے حوالے سے خالد حیدر لکھتے ہیں:

''اس افسانے میں زمیندار کی ہٹ دھرمی، اسامی کی خودداری اور گاؤں کی رسوم کا ذکر اس انداز سے کیا گیا ہے جس سے گاؤں کی زندگی کی صورت حال واضح ہو جاتی ہے۔ افسانے کا انجام بھی ان باتوں کی مناسبت سے حقیقی ہے، لیکن کردار نگاری جس طرح مثالیت کے سائے میں کی گئی ہے اور خودداری و بے غرضی کا جو سبق پریم چند نے پڑھایا ہے وہ اس افسانے کو ایک آدرش وادی افسانہ بھی بنا دیتا ہے۔''(۹)

منشی پریم چند نے ''پنچائیت'' میں دو ایسے دیہاتی دوستوں کی کہانی کو موضوع بنایا ہے جن کی تربیت ایک ہی جگہ ہوئی ہے لیکن قدرت نے انھیں ایسے راستے پر ڈال دیا کہ سارا گاؤں ان پر اعتماد کرنے لگا۔ جب ضرورت پڑتی تو گاؤں والے انصاف کا ترازو دونوں کے ہاتھوں میں تھما دیتے۔ ''پنچائیت'' میں پریم چند نے حق اور انصاف کی بات کی ہے کہ انسان اپنے دوست کو ناانصافی نہیں کرنے دیتا۔ اگر اس کا ایمان تازہ ہو۔ قدرت خود بخود اس انسان کے اندر ایسی صلاحیتیں ڈال دیتی ہے کہ وہ انصاف کرے۔ ڈاکٹر انور سدید اپنی کتاب ''اُردو افسانے میں دیہات کی پیش کش'' میں لکھتے ہیں: ''افسانہ'' پنچائیت'' کا تارو پود انصاف کی اہمیت اور مصنف کے احساسِ فرض کے گرد بنا گیا ہے۔''(۱۰)

دراصل ''پنچائیت'' اپنے سماجی پس منظر، ماحول اور موضوع کے لحاظ سے دیہاتی زندگی کی کہانی ہے۔ جس میں پریم چند ایک مصلح اور رہبر کی طرح عوام کے سامنے آئے ہیں۔ ایک ناصح و مصلح ہونے کے ناطے انھوں نے دیہات کی تصویر کشی بڑے خوبصورت انداز میں کی ہے۔ ''پنچائیت'' اور اس کے اہتمام و انصرام کی جو شکل افسانہ میں ملتی ہے وہ بہت حد تک کسی دیہات میں قائم ہونے والی پنچائیت کی ہو بہو تصویر ہے۔

پنچائیت کی تصویر کشی کے بعد وہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ دیہات کے معصوم سادہ لوح انسان پنچائیت کے فیصلے کو خدا کی مرضی کے مترادف سمجھتے ہیں۔ ان کی نظر میں پنچائیت کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ وہ عدالت کا دروازہ نہیں کھٹکھٹاتے بلکہ دیہات میں ہی پنچائیت لگا لیتے ہیں۔

پریم چند کے افسانے ''راہِ نجات'' کا موضوع دیہات میں بسنے والے سادے لوگوں کی وہ چھوٹی چھوٹی رنجشیں ہیں جو بعد میں بہت بڑے نقصان کا باعث بنتی ہیں۔اس کے ساتھ دیہات کی کچھ ان رسومات کا ذکر ہے جو رہی سہی کسر بھی نکال دیتی ہیں۔ پریم چند نے کسان سے دشمنی کا بھی بیان کیا ہے کہ کسان سے دشمنی کا بدلہ لینا بہت آسان ہے کیونکہ اس کا سرمایہ کھیت ہی ہوتے ہیں اور اُسی پر کسان کو غرور فخر ہوتا ہے۔افسانے سے اقتباس ملاحظہ ہو: ''کیلے کو کاٹنا بھی اتنا آسان نہیں، جتنا کسان سے بدلا لینا۔ان کی ساری کمائی کھیتوں میں رہتی ہے یا کھلیانوں میں۔''(۱۱)

پریم چند کی چشمِ بینا کسانوں کے سماجی مسائل کو اپنی گہری بصیرت افروز وارداتِ قلبی سے حل کرنے کے لیے کوشاں دکھائی دیتی ہے۔اگرچہ وہ ہندو طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔مگر انھوں نے بلاتعصب مذہب وملّت ہندو مسلم سماج کی فرسودہ مذہبی اقدار کی بھرپور مذمت کی ہے۔ان کے بیشتر افسانوں میں پنڈتوں اور برہمنوں کی سخت مذمت ملتی ہے۔ وہ صرف ایک مخلوط ہندوستانی معاشرت کی تشکیل میں کوشاں نظر آتے ہیں۔ذات پات اور سماجی اونچ نیچ کی اس بے بنیاد طرزِ حیات پر بہتے ہوئے انسان ہمیشہ پریم چند کے افسانوں کا حصہ بنتے ہیں۔ان کے یہاں پنڈت، سرمایہ دار، مہاجن، ہندو مسلم منافق لوگوں کے کردار کثرت سے ملتے ہیں۔ یہ لوگ مذہب وسماج کی آڑ میں موقع کا فائدہ اٹھا کر غریب کی مجبوری کو اپنی طاقت سمجھتے ہوئے کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

دیہاتی زندگی اور کسانوں کی زبوں حالی و بے چارگی پریم چند کا ایسا موضوع ہے جو بار باران کے افسانوں کا حصہ بنتا ہے۔ جہاں ''پوس کی رات'' میں کسان اپنے سماج کی فرسودہ روایات واقدار اور مذہبی تعصب کے سامنے بے بس دکھائی دیتا ہے اور اپنی جھوٹی شان وشوکت کو برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ وہاں سوا سیر گیہوں میں پریم چند نے سودخوری جیسے سماجی عوارض میں ملوث پراہت کا غریب کسان کے ساتھ بے رحمانہ اور ظالمانہ رویے کو اپنا موضوع بنایا ہے کہ غریب کسان کس طرح مذہب کے نام لیوا اور پجاری لوگوں کی خدمت میں اپنی زندگی صرف کر دیتے ہیں۔ پسماندہ ممالک میں کس طرح اثر ورسوخ رکھنے والے لوگ غریبوں کا استحصال کرتے ہیں اور ان کی زندگی کی خوشیاں چھینتے آئے ہیں۔

پریم چند کے افسانہ ''پوس کی رات'' کا مرکزی خیال پسماندہ اور غربت کے چنگل میں پھنسے کسان کا طرزِ کہن پر اڑا رہنا ہے۔ وہ اپنی ذاتی انا پرستی اور اپنے آباؤاجداد کے پیشے کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں۔ ہلکو کی بیوی اُس کو لاکھ سمجھاتی ہے کہ کھیتی باڑی چھوڑ دو پر وہ اپنی انا کے ہاتھوں مجبور ہے۔اسی حوالے سے اقتباس ملاحظہ ہو: ''جی میں تو میرے بھی یہی آتا ہے کہ کھیتی باڑی چھوڑ دوں منی۔ تجھ سے سچ کہتا ہوں مگر مجبوری کا کھیال کرتا ہوں تو جی گھبرا اُٹھتا ہے۔ کسان کا بیٹا ہو کر اب مجبوری نہ کروں گا۔ چاہے کتنی درگت ہو جائے کھیتی کا مرجادہ نہیں بگاڑوں گا۔''(۱۲)

پسماندہ ممالک کے کسانوں کی زندگی غربت، پسماندگی، مفلوک الحالی، جہالت ودقیانوسیت کا عبرت ناک مرقع ہوا کرتی تھی۔خورشید عالم اپنی کتاب ''اُردو افسانے میں گاؤں کی عکاسی'' میں لکھتے ہیں: ''پریم چند کا شتکار اور ساہوکار وغیرہ کے باہمی تعلقات کے ساتھ ساتھ قدرتی آفات اور اُن کے حالات کے پس منظر میں بھی کاشتکار اور محنت کش کو دیکھتے ہیں۔''(۱۳)

پریم چند کے عہد کے سماج کا المیہ یہ بھی ہے کہ اس میں ارتقائی عمل رُک سا گیا ہے۔لوگ جیسے ہیں ویسا ہی رہنا چاہتے ہیں۔ ان میں تگ ودو کا مادہ نہیں رہا۔ یہ سماج درحقیقت بے حسی کا لبادہ اوڑھ کر بعض بے معنی سماجی اقدار و روایات اور مذہبی میلانات کے آگے لاچار نظر آتا ہے۔

''پوس کی رات'' کا مرکزی خیال برّصغیر کے پسماندہ اور غربت میں دھنسے ہوئے کسان کی بدحالی کا نوحہ ہے۔ وہ اپنی پُرانی اقدار اور روایات کا قیدی ہے۔ کسان اپنی کھیتی باڑی کو آباؤاجداد کا پیشہ سمجھ کر چھوڑنا نہیں چاہتا۔ بے شک اسے اپنی جان کیوں نہ قربان کرنی پڑے۔ وہ بدحالی، مفلسی کا شکار تو ہو جاتا ہے لیکن اپنی فرسودہ مذہبی و سماجی اقدار و روایات سے باغی نہیں ہوتا اور نہ ہی ہونا چاہتا ہے۔ وہ وہی زندگی گزارنا چاہتا ہے جیسے ان کے آباؤاجداد نے گزاری تھی۔ مقروض کا بیٹا مقروض ہی رہنا چاہتا ہے لیکن وہ اپنے پیشے کو نہیں چھوڑنا چاہتا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس پیشے میں سوائے بدحالی اور مفلسی کے کچھ نہیں رکھا۔ پھر بھی وہ اسے اپنائے رکھنا چاہتا ہے۔ ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ پریم چند کے افسانوی کرداروں کی بنیادی کمزوری ہے۔ انسان ماضی میں ہونے والی فروگزاشتوں سے سیکھ کر اچھے مستقبل کی فکر کرتا ہے مگر طرزِ قدیم پر مستقل مزاجی سے کاربند رہنا بھی بے وقوفی سے عبارت ہے۔ پریم چند نے اپنے سماجی شعور کے پیشِ نظر اس عہد کے سماج پر طاری جمود کو توڑنے کی کوشش کی ہے۔ جمودِ حیاتِ انسانی اور فطرت کے لیے موت کا عندیہ لے کر آتا ہے۔ حرکت میں زندگی ہے۔ دراصل پریم چند نے اس وقت کی فرسودہ اقدار و روایات کو بھی پیش کر رہا ہے۔ ''اُردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل'' میں پروفیسر صغیر ابراہیم لکھتے ہیں: ''پریم چند نے ''پوس کی رات'' میں کسان کے اسی المیے کی داستان سنائی ہے جو باوجود سخت محنت کے اتنا بھی پس انداز نہیں کر پاتا کہ سرما کی طویل راتوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ کر کھیتوں کی صحیح نگہداشت کر سکے۔''(۱۴)

پریم چند کا افسانہ ''گھاس والی'' ایک مکمل رومانوی افسانہ ہے جس میں عورت سے مرد کی بے لوث محبت کا تذکرہ ہے۔ جب انسان کسی سے سچی محبت کرتا ہے تو اس کی محبت میں بدل بھی جاتا ہے۔ جو اس میں امیری کا نشہ ہوتا ہے وہ ختم ہو جاتا ہے وہ نرم دل اور انسانوں کو انسان سمجھنے لگتا ہے۔ یہ سب اس پر فطری طور پر ملیا کی محبت کا اثر ہوتا ہے۔ چین سنگھ کی تبدیلی ان کے کردار کو آدرش وادی بنا دیتی ہے۔

''گھاس والی'' میں اس بات کو بھی باور کیا گیا ہے کہ جدید ٹیکنالوجی سے دیہات کے لوگ کس طرح متاثر ہوتے ہیں۔ ٹیکنالوجی سے دیہاتیوں کی آمدنی کم ہو جاتی ہے۔ جس کے منفی اثرات ان کے ذریعۂ آمدن پر پڑتے ہیں۔ پریم چند کے عہد میں برطانوی سامراج تھا تو ہندوستان میں تبدیلیاں ہو رہی تھی۔ ہر طرف نئی حکومت اپنی من مانی کر رہی تھی۔ ہندوستان کی ۸۰ فیصد آبادی دیہات میں رہتی تھی۔ شہروں میں جدید ٹیکنالوجی آ رہی تھی تو دیہاتی اس سے بے روزگار ہو رہے تھے۔ مہابیر دیہات سے شہر کی طرف روزگار کے سلسلے میں جاتا ہے لیکن شام کو گاؤں مایوسی کی حالت میں لوٹتا ہے کیونکہ اب جدید ٹیکنالوجی کا راج چل رہا تھا۔ شہروں میں یکہ کی جگہ لاریاں آ گئی تھیں۔

پریم چند نے دیہات کے کئی سماجی پہلوؤں کو منفرد انداز میں زینتِ قلم کیا ہے وہ نہایت فنکارانہ طریقے سے بعض اخلاقی کمزوریوں اور طبقاتی رنجشوں سے پردہ اُٹھاتے ہیں۔ جس سے افسانوں میں قاری کے لیے دلچسپی کا عنصر باقی رہتا ہے۔ وہ کہانی میں شروع سے لے کر آخر تک قاری کو اپنے سحر میں جکڑ رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں خالد حیدر یوں رقم طراز ہیں: ''اس میں کوئی شک نہیں کہ پریم چند نے اپنے متعدد افسانوں میں انجام کو آدرش وادی رُخ دے کر حقیقت پسندی سے آنکھیں چُرانے کی کوشش بھی کی ہے لیکن افسانوں میں بھی دیہی سماج کے مختلف مسائل کسی نہ کسی شکل میں سامنے آتے ہیں۔''(۱۵)

پریم چند کے افسانہ ''نجات'' کا بنیادی موضوع اچھوتوں کی غربت و افلاس، جہالت، وہم پرستی اور مقتدر افراد کا لاچار طبقے پر سماجی و معاشی استحصال ہے۔ دوسری طرف برہمن جو اپنے آپ کو اعلیٰ طبقہ سمجھتے ہیں ان کے اعتقادات کی تصویر کشی ہے۔ وہ

نیچ ذات کے لوگوں کا استحصال کن کن روپ میں کرتے ہیں۔ان نیچ ذات لوگوں کی سماج میں کیا حیثیت ہے۔

پریم چند مہاجنوں، برہمنوں کے خلاف شدید احتجاج کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ غریبوں کا جونک کی طرح خون چوس کران کا استحصال کرتے ہیں۔ان کی معصومیت اور سادہ لوحی کا فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ پریم چند چونکہ ہندو تھے اور ہندو مذہب کا انھوں نے اپنی گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا اسی لیے پنڈت، سادھو، مہاجنوں، برہمنوں کی حلیہ نگاری کی تفصیل بڑی جزئیات سے بیان کرتے ہیں۔

پریم چند کا افسانہ ''کفن'' دسمبر ۱۹۳۵ء میں ''انگارے'' کی اشاعت و ضبطی (اپریل ۱۹۳۳ء) کے بعد اور انجمن ترقی پسند مصنّفین کے قیام (اپریل ۱۹۳۴ء) سے چار ماہ پہلے شائع ہوا تھا۔''کفن''(۱۶) میں دیہاتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کی گئی ہے لیکن بنیادی موضوع وہ سماجی صورت حال ہے جس میں انسان انسانیت کے درجےسے گرجاتا ہے۔اوراس سے بعض ایسی حرکات سرزد ہونے لگتی ہیں جو فطرتِ انسانی سے بعید معلوم ہوتی ہیں۔اس میں تین کرداروں مادھو، گھیسو اور بدھیا کے ذریعے چماروں کی جس مفلسی کا تذکرہ کیا گیا ہے، وہ دراصل ایسے تمام طبقات کی نمائندگی کرتا ہے جو گاؤں میں بستے ہیں۔ان کے گھر اور سماجی حالات کی جس انداز میں تصویرکشی کی گئی ہے اس میں اس وقت کے ایسے تمام طبقات کی جھلک ملتی ہے جو کہ گاؤں میں رہنے والے ہیں۔

پریم چند نے اپنے ابتدائی افسانوں کے مقابلے میں آخری عمر میں افسانہ نگاری میں معاشرے میں ہونے والے ظلم و ستم کے کئی تلخ حقائق کو قاری کے سامنے پیش کیا ہے۔اوراسی تلخ حقیقت کو انھوں نے ''کفن'' میں اُجاگر کیا ہے۔

افسانوں کے اس اجمالی جائزہ کے بعد پریم چند کے افسانوں میں دیہی حقیقت نگاری کے متعدد پہلو نمایاں ہوتے ہیں، دیہات کی سماجی صورت حال، وہاں کا تہذیب وتمدن، زبان ولباس ان کے مذہبی نظریات اور ان نظریات کے متعلق توہمات اوراعتقاد، پنچایتوں کا نظام، خلوص و وفا، کھیتی باڑی اوراس کے مسائل، دیہاتیوں کی سادہ لوحی، زمیندارانہ نظام، پولیس کے مظالم اوران کا جبر واستبداد، دیہاتیوں کی خوشحالی اور ایک دوسرے سے رویے، ان کے مسائل دیہات میں ایک دوسرے سے میل جول، دشمنی اور کدورت، محبت ورفاقت غرض کہ کوئی پہلو نہیں ہے جسے پریم چند نے اُجاگر نہ کیا ہو۔

حوالہ جات

۱۔ صدیقی،عظیم الشان، ڈاکٹر/فقیر حسین، ڈاکٹر، مرتبین: اُردو افسانہ: فکری وفنی مباحث، لاہور: بک ٹاک، ۲۰۱۴ء، ص:۱۰۶

۲۔ صغیر ابراہیم، پروفیسر، اُردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۰۹ء، ص:۴۰

۳۔ گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، اُردو افسانہ روایت اور مسائل، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، ص:۱۱۱

۴۔ صدیقی،عظیم الشان، ڈاکٹر/فقیر حسین، ڈاکٹر، مرتبین: اُردو افسانہ: فکری وفنی مباحث، ص:۱۰۷

۵۔ فرزانہ شاہین، اُردو کے نمائندہ افسانہ نگار، کلکتہ: ڈائمنڈ آرٹ پریس، ۲۰۰۹ء، ص:۲۳

۶۔ نریندر کمار، مرتبہ: پریم چند کی کہانیاں وافسانے، نئی دہلی: ڈائمنڈ پیکٹ بک، س ن، ص:۵

۷۔ فردوس انور قاضی، ڈاکٹر، اُردو افسانہ نگاری کے رجحانات، لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۹ء، ص:۱۴۳

۸۔ صدیقی،عظیم الشان، ڈاکٹر/فقیر حسین، ڈاکٹر، مرتبین: اُردو افسانہ: فکری وفنی مباحث، ص:۱۱۱۔۱۱۰

۹۔ خالد حیدر، پریم چند کے افسانے (حقیقت نگاری اور دیہی زندگی)، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۹۹ء، ص:۱۱۱۔۱۱۰

۱۰۔ انور سدید، ڈاکٹر، اُردو افسانے میں دیہات کی پیش کش، لاہور: ابلاغ پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص:۲۶
۱۱۔ پریم چند، منشی، مجموعہ منشی پریم چند (افسانے)، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص:۹۳۵
۱۲۔ ایضاً، ص:۴۳۰
۱۳۔ خورشید عالم، اُردو افسانے میں گاؤں کی عکاسی، دہلی: نیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۴ء، ص:۴۰
۱۴۔ صغیر ابراہیم، پروفیسر، اُردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل، ص:۵۰
۱۵۔ خالد حیدر، پریم چند کے افسانے (حقیقت نگاری اور دیہی زندگی)، ص:۲۱۵
۱۶۔ اورنگ زیب عالمگیر، ڈاکٹر، پریم چند تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، لاہور: سنگت پبلشرز، ۲۰۰۵ء، ص:۳۱

☆......☆......☆